البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ صٓ

(۳)

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝۳۰

اور داؤد کو ہم نے سلیمان[۱۴۳] (جیسا بیٹا) عطا کیا[۱۴۴]۔ کیا ہی خوب بندہ تھا[۱۴۵]! کچھ شک نہیں کہ وہ خدا کی طرف بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا[۱۴۶]۔ ۳۰

۱۴۳۔ سلیمان علیہ السلام کا زمانۂ سلطنت ۹۶۵ ق م سے لے کر ۹۲۶ ق م تک ہے۔

۱۴۴۔ یہ ذکر جس طریقے سے ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام کو وہ خدا کی طرف سے اُن کے حسن عمل کے صلے میں انعام کے طور پر دیے گئے تھے۔

۱۴۵۔ سلیمان علیہ السلام کے کمال عبدیت پر یہ خود اُن کے پروردگار کی شہادت ہے۔ اِس کے بعد وہ کیا چیز ہے جس کی کوئی بندۂ مومن اِس دنیا میں تمنا کر سکتا ہے؟

۱۴۶۔ یہی صفت داؤد علیہ السلام کے لیے بھی بیان ہو چکی ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اِس صفت میں گویا وہ اپنے جلیل القدر باپ کا ہو بہو عکس تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...’عبدیت‘ کا اصلی جمال ’اوابیت‘ میں ہے، یعنی بندے کا دل ہر وقت خدا کی طرف متوجہ رہے اور اگر کبھی کسی سبب سے ذرا بھی غفلت ہو جائے تو اِس طرح ٹوٹ کر اپنے رب کی طرف گرے کہ برسوں کی منزل منٹوں میں طے کر لے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی یہی ادا سب سے زیادہ پسند ہے۔ گناہ سے آدمی جتنا

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

یاد کرو،[۱۴۷] جب خاصے کے اصیل اور عمدہ گھوڑے شام کے وقت اُس کے ملاحظے کے لیے پیش کیے گئے (اور اُن کے دیکھنے میں وہ ایسا محو ہوا کہ نماز جاتی رہی[۱۴۸]) تو اُس نے کہا: یہ تو اپنے پروردگار کی یاد سے غافل ہو کر، میں مال کی محبت میں لگ گیا،[۱۴۹] یہاں تک کہ آفتاب (مغرب کے) پردے میں چھپ گیا ہے[۱۵۰]۔ اُن کو میرے پاس واپس لاؤ۔ (وہ لائے گئے) تو (غلبۂ حال

کھوتا ہے، اُس سے کہیں زیادہ وہ اُس سے پا لیتا ہے، اگر وہ سچے دل سے گناہ کے بعد توبہ کر لیتا ہے۔‘‘

(تدبر قرآن ۶/ ۵۳۰)

۱۴۷۔ اوپر جس طرح حضرت داؤد کی اوابیت کو مثال سے نمایاں کیا ہے، اُسی طرح اب یہ حضرت سلیمان کی اوابیت کی مثال بیان ہو رہی ہے۔

۱۴۸۔ قرآن نے یہ بات الفاظ میں بیان نہیں کی، لیکن آگے کا جملہ اِسے واضح کر رہا ہے۔

۱۴۹۔ آیت میں فعل ’اَحْبَبْتُ‘ حرف ’عَنْ‘ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ یہ اِس بات کا قرینہ ہے کہ ’اَحْبَبْتُ‘ یہاں اعراض یا غفلت کے مفہوم پر متضمن ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہے کہ جس نماز سے غفلت ہوئی، وہ عصر کی نماز تھی۔ اِس لیے کہ دن کے آخری حصے میں اور غروب آفتاب سے پہلے یہی نماز ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ انبیا علیہم السلام کے دین میں نماز کے اوقات ہمیشہ وہی رہے ہیں جن کے مطابق اب ہم نمازیں ادا کرتے ہیں۔

۱۵۰۔ اصل الفاظ ہیں: ’حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ‘۔ اِن میں ’تَوَارَتْ‘ کا فاعل ’الشَّمْس‘ ہے جسے آیت میں حذف کر دیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’... عربی میں معروف و مشہور چیزوں کے لیے فعل بھی اِس طرح لاتے ہیں اور ضمیریں بھی۔ فاعل یا مرجع کو قرینے سے سمجھ لیتے ہیں۔ یہاں لفظ ’عَشِیّ‘ کی وجہ سے قرینہ واضح تھا، اِس وجہ سے فاعل کے اظہار

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

میں) وہ اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں پر تلوار کے ہاتھ چلانے لگا۔[۱۵۱] ۳۱-۳۳

ہم نے سلیمان کو (ایک اور) آزمایش میں بھی ڈالا تھا اور اُس کے تخت پر ایک دھڑ کی طرح ڈال دیا تھا۔[۱۵۲] پھر اُس نے رجوع کیا[۱۵۳] (اور) دعا کی کہ میرے پروردگار، مجھے معاف فرما دے اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے سوا کسی کے لیے زیبا نہیں[۱۵۴]۔ بے شک، تو بڑا ہی بخشنے والا ہے۔

کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۵۳۱)

۱۵۱۔ آیت میں لفظ 'طَفِقَ' اشارہ کر رہا ہے کہ یہ غلبۂ حال ہی کی ایک صورت تھی۔ اِس طرح کی کیفیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بھی طاری ہو گئی تھی۔ قرآن نے یہ واقعہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، سلیمان علیہ السلام کے جوش انابت اور غلبۂ اوابیت کے اظہار کے لیے سنایا ہے اور اِس لحاظ سے یہ بلاشبہ ایک شان دار واقعہ ہے۔ اِس سے دین و شریعت کے اصول و ضوابط اخذ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

۱۵۲۔ یعنی ایسا بے بس اور غم زدہ بنا دیا تھا کہ اُس کے تخت پر گویا صرف ایک جسم پڑا ہوا رہ گیا جس میں سے روح نکل گئی تھی۔ یہ اُن حالات کی طرف اشارہ ہے، جب دشمنوں نے یورش کر کے اُن کے بیش تر علاقے چھین لیے اور باقی مقامات پر بھی ایسی گڑبڑ پھیلا دی تھی کہ نظم حکومت بالکل درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان اُس زمانے میں اپنے دارالحکومت میں بالکل محصور و مجبور ہو کر رہ گئے تھے۔ قرآن نے اِس پوری صورت حال کو کمال بلاغت کے ساتھ ایک جملے میں سمیٹ دیا ہے کہ ہم نے سلیمان کو اُس کے تخت پر ایک دھڑ کی طرح ڈال دیا۔

۱۵۳۔ یعنی ایسے حالات میں بھی وہ مایوس نہیں ہوئے، بلکہ یہ خیال کر کے کہ شاید کسی غلطی پر اُن کی پکڑ ہوئی ہے، وہ توبہ و استغفار کے لیے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو گئے۔

۱۵۴۔ یعنی میرے گناہوں کے باوجود ایسی بادشاہی دے جس کا سزاوار نہ میں ہوں، نہ میرے بعد کوئی اور ہو گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس دعا میں اصلی زور بادشاہی کی بے مثال عظمت و شوکت پر نہیں، بلکہ بلا استحقاق بادشاہی دیے جانے پر

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾
وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾
هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا

سو ہم نے ہوا کو اُس کی خدمت میں لگا دیا جو اُس کے حکم سے، جدھر وہ جانا چاہتا تھا، سازگار ہو کر چلتی تھی۔[۱۵۵] ۳۴-۳۶

اور سرکش جنوں کو بھی اُس کے لیے مسخر کر دیا، ہر طرح کے ماہر معماروں اور غوطہ خوروں کو، (جو کام میں لگے رہتے) اور اُن کے علاوہ دوسروں کو بھی، جو زنجیروں میں بندھے رہتے تھے[۱۵۶]۔ ۳۷-۳۸

یہ ہماری بے حساب بخشش ہے[۱۵۷]، اب تم (لوگوں کو دو اور) احسان کرو یا اُس کو روکے

ہے کہ مجھے میرے گناہوں کے باوجود بادشاہی دے، جب کہ میرے بعد کوئی اور اِس کا سزاوار نہیں ٹھیرے گا۔ اِس دعا میں اپنے گناہ کا جو شدید احساس ہے، وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی غایت خشیت وانابت کی دلیل ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۵۳۴)

۱۵۵۔ مطلب یہ ہے کہ بادبانی نظام کو وہ ایسی ترقی دینے میں کامیاب ہو گئے کہ اُس سے ہواؤں کو اِس طرح کنٹرول کیا جا سکتا تھا کہ سخت سے سخت طوفانی ہوائیں بھی سفر کے لیے سازگار ہو جاتی تھیں اور اُن کے جہاز، جہاں وہ چاہتے، بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچ جاتے تھے۔ آیت میں اِس کے لیے لفظ 'اَصَابَ' استعمال ہوا ہے، یعنی جس مقام کو چاہتے اپنا ہدف بنا لیتے اور جب چاہتے، وہاں کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔

۱۵۶۔ یعنی ایک ایسا علم بھی اُس کو عطا فرمایا تھا کہ اُس سے شریر جنوں کو مسخر کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اُن میں سے کچھ کو پکڑ کر کاموں میں لگا دیا جاتا اور کچھ زنجیروں میں قید پڑے رہتے تھے کہ ضرورت کے وقت کام میں لگائے جا سکیں۔ آیت میں اُن کے لیے 'كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں لفظ 'كُلّ' ہمارے نزدیک صفت کی تاکید کے لیے ہے، جیسے 'هو العالم كل العالم'۔

۱۵۷۔ یعنی تمھارے قیاس و گمان اور امیدوں اور توقعات سے ماورا جس کا تم خواب و خیال میں بھی تصور

لَزُلْفٰی وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾

رکھو۔[۱۵۸] (ہم نے سلیمان سے کہا تھا) اور ہمارے پاس (آگے بھی) یقیناً اُس کے لیے تقرب کا خاص مقام اور اچھا انجام ہے۔۳۹-۴۰

نہیں کر سکتے تھے۔

۱۵۸۔ یہ اُس اختیار کا بیان ہے جو ہر مالک کو اُس کی ملکیت میں حاصل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دینا چاہے یا روکنا چاہے، یہ سب اُس کی صواب دید تھی۔ وہ اپنی ملکیت میں اخلاقی حدود کے اندر جس طرح چاہے، تصرف کر سکتا تھا۔

[باقی]